یہ لوحِ مزار تو میری ہے

اشعر نجمی

اشعر نجمی کی یہ کتاب عشق کی کرامات میں سے ایک ہے۔ میں اس کتاب کو کرامت، اشعر اور فاروقی صاحب کے رشتے کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ عموماً کسی عزیز کی جدائی، رنج وغم میں یوں مبتلا کرتی ہے کہ کبھی ٹک کر اپنی جگہ نہ بیٹھنے والا بھی نڈھال ہو کر یوں بیٹھ جاتا ہے کہ کوئی کام نہیں کر پاتا۔ اشعر، فاروقی صاحب سے بہت ہی قریب تھے۔

'یہ لوح مزار تو میری ہے' طویل مضمون ہے، مختلف کیفیات، تاثرات اور مختلف طرح کے رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹے اس مضمون کو اگر میں یہ کہوں تو شاید بہتر ہوگا کہ اشعر نجمی نے اس مضمون کے ذریعے اپنی بازیافت کی ہے۔ اس میں اشعر کا بچپن بھی ہے، گھر اور والدین بھی ہیں اور بہار و ممبئی کی ادبی فضا بھی۔ ادبی سازشوں کا بھی ذکر ہے اور 'اثبات' کے نکلنے اور بند ہونے کا بھی۔ لیکن یہ سب فاروقی صاحب کے حوالے سے ہے۔

شکیل رشید

ESBAAT PUBLICATIONS
more than just books

esbaat quarterly
+91 8169002417
@Asharnajmi2
esbaat_editor
asharnajmi2020@gmail.com
www.asharnajmi.com

9789391037246
₹ 500/-

یہ لوحِ مزار تو میری ہے

(یادیں)

اشعر نجمی

ESBAAT
PUBLICATIONS
more than just books

© Esbaat Publications

Ye Lauh-e-Mazaar to Meri Hai (Memoir)
by Ashar Najmi
Esbaat Publications, Thane, India
1st Edition : February, 2022
Printer: pothi.com
ISBN: 978-93-91037-24-6

Rs. 500/-

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مصنف یا ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کلّی یا جزوی، منتخب یا مکرر اشاعت یا بہ صورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، میکینیکل یا ویب سائٹ پر اَپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ نیز اس کتاب پر کسی بھی قسم کے تنازعہ کو نمٹانے کا اختیار صرف ممبئی کی عدلیہ کو ہوگا۔

کتاب: یہ لوحِ مزار تو میری ہے (یادیں)

مصنف: اشعر نجمی

اشاعت دوم: فروری ۲۰۲۲

سرورق: رشید میڈیا (مئو)

خطاط: منور کاتب

سوشل میڈیا ایگزیکٹیو: رضوان الدین فاروقی

ESBAAT PUBLICATIONS
more than just books

B-202, Universe Darshan, Pooja Nagar Road, Naya Nagar,
Mira Road (East), Dist. Thane - 401107, Maharashtra, India
Contact: +91 8169002417 Email: asharnajmi2020@gmail.com
www.asharnajmi.com

انتساب

شمس الرحمٰن فاروقی کے تمام قارئین اور
ان کے قدردانوں کے نام

بشکریہ: جینت پرمار

پیش لفظ

ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، فاروقی صاحب کو گزرے ہوئے بھی اور 'وہ جو چاند تھا سر آسماں' کی اشاعت کو بھی، لیکن اس کے باوجود فاروقی صاحب کی یادوں کے زخم اب تک ہرے ہیں۔ یاد ایک پیچ دار کیل ہے جسے قائم ہونے میں جتنی مشقت لگتی ہے، اس سے کم اسے بے دخل کرنے میں نہیں لگتی۔

اگر چہ بہت سی یادیں تیزی سے خرچ ہو جاتی ہیں، وقت کھسکتا رہتا ہے اور ایک دن ہم یادوں سے باہر بھی ہو جاتے ہیں لیکن صرف وہ یادیں جو عجلت پسند ہوتی ہیں، جو جلدی بنتی بھی ہیں اور جلد کھو بھی جاتی ہیں۔ میں نے 'وہ جو چاند تھا سر آسماں' میں اپنی یادوں کو 'یہ لوح مزار تو میری ہے' کے نام سے شیئر کیا تھا، لیکن فاروقی صاحب کی یادوں کو اس فراخ دلی سے خرچ کرنے کے باوجود میں کنگال نہ ہو پایا۔ بہت کچھ بچا ہوا ہے لیکن شاید میں کسی بچے کا ایسا کھلا ہوا جیومیٹری باکس بن چکا ہوں جس کے اوزار کلاس میں لاپرواہی سے کھو گئے ہیں اور اسی لاپرواہی کے ساتھ کھو گیا ہے وہ استحقاق طبابت بھی جو زحمت کا رفو سے عاجز نظر آتا ہے۔ میں دن بھر سوچتے ہوئے ان یادوں کو اپنے دماغ کے کسی کونے میں محفوظ کرتا رہتا ہوں اور شام ہوتے ہوتے میرا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ سمندر کو دو آنکھوں سے نہیں سمیٹا جا سکتا۔ پانی کے اس حصے پر ایک سوکھی اور نم آنکھ کا حساب ہر بار نہیں کیا جا سکتا۔ وداع کا ہر احساس خود کی ہتھیلی کے لمس کو فراموش کرنے جیسا ہے۔

میرے تصور میں فاروقی صاحب کا آنا جانا اب بھی جاری ہے لیکن میں ان کی شکل نہیں دیکھ پاتا۔ بارش کی شکل کیسے نہاروں؟ بارش کو ایک پل نہارتے ہی آنکھیں بھر آتی ہیں، پوری دنیا

ڈبڈبا جاتی ہے۔ بارش کو دیکھ نہیں سکتے، اسے صرف سن سکتے ہیں۔ بارش کو دیکھنا دھوکا ہے۔ بارش کے نقوش بنتے بگڑتے رہتے ہیں، اس کا کوئی مکمل چہرہ نہیں ہوتا۔

بہت سے احباب کی مسلسل فرمائش تھی کہ اپنی ان یادوں کو میں ایک علیحدہ کتاب کی شکل دے دوں۔ اگرچہ یادوں کو الفاظ میں سمیٹا نہیں جاسکتا، بھلا دھوئیں یا غبار کو پکڑا جاسکتا ہے، لیکن اس کا التباس تو پیدا کیا ہی جاسکتا ہے۔ زیرنظر کتاب ان یادوں کا miniature ہے جسے صرف تصور میں enlarge کر کے اس کی شدت اور حدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ان حضرات کا بہت شکریہ جنھیں میری یادوں نے انگیز کیا جس کے نتیجے میں کچھ نہایت ہی اہم تاثرات وتبصرے منظرعام پر آئے۔

اشعر نجمی

۲۷ جنوری ۲۰۲۲ء

یہ لوح مزار تو میری ہے پھر اس پہ تمھارا نام ہے کیوں
یہ مزار ہی کیوں مجھے لگتا ہے ہر قبر میں، میں ہی لیٹا ہوں
[شمس الرحمٰن فاروقی]

-1-

تمھاری ایمیل ملے کوئی تین مہینے ہو رہے ہیں۔ میں اتنی دیر تک خاموش اس لیے رہا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھوں۔ بظاہر تمھاری تسلی میری کسی بات سے نہیں ہو سکتی۔ تمھاری حالت اس بوڑھے بھیڑیئے جیسی ہے جسے اس بچہ گوسفند پر کوئی بھی الزام لگا کر اس کا خون بہر حال کرنا تھا۔۔۔۔ اب میری طرف سے سلسلہ بند سمجھو، بلکہ اب تمام سلسلے بند سمجھو۔

[شمس الرحمٰن فاروقی، ۲۱ دسمبر، ۲۰۱۳]

یہ فاروقی صاحب کا میرے نام آخری ایمیل تھا جو میرے ایمیل کے جواب میں آیا تھا۔ مجھے فاروقی صاحب کے اس ردعمل سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا تھا، دراصل میں ان سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اگر وہ میرے ایمیل کو نظر انداز کر جاتے تو شاید مجھے مایوسی ہوتی لیکن انھوں نے جواب دے کر گویا میری اس ذہنی اذیت پر فل اسٹاپ لگا دیا تھا جس سے میں ان دنوں دو دو ہاتھ کر رہا تھا۔ ایمیل پڑھ کر اطمینان کی ایک سانس لی، چلو اچھا ہوا یہ قصہ ختم ہوا۔ لیکن یہ قصہ شروع کہاں سے ہوا تھا؟

میری عمر اس وقت شاید سترہ اٹھارہ سال تھی، دسویں کلاس کا طالب علم تھا۔ لیکن ان دنوں میں نصابی کتابیں کم، پاپولر لٹریچر زیادہ پڑھتا تھا۔ ابا اور اماں میری پڑھائی کے معاملے میں کافی سخت تھے۔ ابا نے دو دو ٹیوشن مجھ پر تھوپ رکھے تھے، جن میں ایک ٹیچر مجھے سائنس اور ریاضی پڑھانے گھر آتے تھے اور بقیہ مضامین ایک دوسرے ٹیچر سے پڑھنے کے لیے میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر پر میری پڑھائی کی ذمہ داری میری والدہ کے سر تھی جو تعلیم یافتہ تھیں۔ لیکن ان تمام پہرے داریوں کے باوجود میں نے پاپولر لٹریچر پڑھنا کبھی نہیں چھوڑا۔

پریکٹیکل کی بڑی بڑی کاپیوں کے اندر چھپا کر ڈائجسٹ پڑھنا چوری کے گڑ کھانے سے زیادہ ذائقہ دار لگتا تھا اور اسی ذائقے نے مجھے نویں کلاس کے امتحانات میں فیل کر دیا تھا اور اس طرح میں اپنے ہم مکتبوں سے ایک سال پیچھے چلا گیا۔ ان دنوں ابن صفی کا بڑا نام تھا لیکن میری دلچسپی کبھی بھی جاسوسی کہانیوں میں نہیں رہی، البتہ دیبا خانم، رضیہ بٹ، کرشن چندر، گلشن نندہ، رانو اور ہاں مظہر الحق علوی کے ترجموں پر تقریباً روزانہ میں قبضہ جمائے رہتا تھا۔ میرے ذوق کی کفالت محلے کی ایک چھوٹی سی اردو لائبریری کر دیا کرتی تھی جس کی ممبر شپ میں نے اپنے جیب خرچ کے عوض لے رکھی تھی۔

ان دنوں میں باقاعدہ اپنے پسندیدہ رسائل خریدا کرتا تھا، پیسے زیادہ نہیں ہوا کرتے تھے، سو سینے پر پتھر رکھ کر صرف ایک دو ہی خرید پاتا تھا۔ اس وقت بہت سارے رسائل نکلا کرتے تھے؛ بیسویں صدی، شمع، بانو، شبستان، ہما، ھدیٰ، جرائم، فلمی ستارے وغیرہ وغیرہ۔ جب بھی جیب تھوڑی سی وزنی ہو جاتی، میں کتاب کی دکان پر لپکتا اور نئے شماروں پر ٹوٹ پڑتا۔ ورق گردانی سب کی کرتا لیکن ظاہر ہے خریدتا ایک ہی، بالکل اسی طرح جیسے خواتین پوری دکان کو اُلٹنے پلٹنے کے بعد ایک دوپٹہ یا ایک بلاؤز خرید کر دکاندار پر احسان کر جاتی ہیں۔ لیکن اس اکلوتے رسالے کی طرف میں نے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا جو دیدہ زیب سرورق رسالوں کے درمیان مسکین صورت پڑا رہتا تھا، نام بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا؛ 'شب خون'۔ بھلا یہ بھی کوئی ادبی رسالے کا نام ہوا؟ ایک بار کی بات ہے، اس دن جیب گرم تھی، میں نے دکان کی طرف رخ کیا۔ بڑی مایوسی ہوئی، میرے کسی بھی پسندیدہ رسالے کا نیا شمارہ نہیں آیا تھا البتہ اسی مسکین پرچے 'شب خون' کا نیا شمارہ اسٹال پر مجھے آنکھیں مار رہا تھا۔ میں نے منھ بنایا لیکن مجھے سنیما گھر اور کتابوں کی دکان سے خالی ہاتھ لوٹنا کبھی پسند نہ آیا، سو اسے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ سوچا کہ میری پسندیدہ رسالوں کے مقابلے میں قیمت کافی کم ہے، چلو بیکار نکلا بھی تو زیادہ پیسے ضائع نہیں ہوں گے، خرید لیا۔

پڑھنے کے بعد اس پرچے کا رعب تو دماغ میں بیٹھ گیا لیکن سمجھ میں کچھ خاک نہ آیا۔ پیسے وصول کرنے کی غرض سے دماغ پر کافی زور ڈال کر پھر پڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی کچھ پلے نہ پڑا؛ نہ غزلیں، نہ افسانے، نہ مضامین، البتہ ایک بات سمجھ گیا تھا کہ یہ پرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہے نہ کہ ہم جیسے چٹخارے بازوں کے لیے۔ میں اپنے 'ذائقے' پر قانع تھا، سو 'شب خون' کو کنارے پھینکا اور گلشن نندہ سے تجدیدِ یاری کر لی۔